

روزہ — قرآن مجید کی روشنی میں

[مدیر ”اشراق“ کے افادات سے مرتب کیا گیا]

اسلامی شریعت میں جو عبادات لازم کی گئی ہیں ان میں نماز اور انفاق کے بعد روزے کی عبادت ہے۔ قرآن مجید کے مطابق یہ کوئی نئی عبادت نہیں ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مشروع ہوئی ہے۔ یہ قدیم ترین عبادت ہے جو امت مسلمہ سے پہلی امتوں پر بھی فرض رہی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرہ ۲: ۱۸۳)

”ایمان والو! تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح
تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ
حاصل کرو۔“

اللہ تعالیٰ نے اول البشر حضرت آدم علیہ السلام ہی کے زمانے سے انسانوں کو اپنی ہدایت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔
اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبَعَ هُدَايَ
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
”تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت
آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے
لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ (البقرہ ۲: ۳۸)

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کا پہلا وعدہ ہے۔ حضرت آدم کی لغزش سے انسانی فطرت اور انسانی عقل کا وہ ضعف ظاہر ہو گیا جو انسان کو وحی الہی کی رہنمائی اور انبیاء علیہم السلام کی دست گیری کا محتاج ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کی اس کمزوری پر نگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بطور تسکین و تسلی یہ وعدہ فرمایا کہ وہ خود اپنی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے روشنی بھیجے گا تو جو لوگ اس روشنی کی قدر کریں

گے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔“ (تذکرہ قرآن ۱/۱۷۰)

دین الہی کی صورت میں یہ ہدایت انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے بنی نوع انسان کو مسلسل ملتی رہی ہے۔ اس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ انھوں نے دین کے بنیادی احکام انبیاء کی روایت کی حیثیت سے اپنی امت میں جاری فرمائے۔ ان میں سے بعض قرآن مجید کے ذریعے سے اس امت پر لازم ہوئے ہیں اور بعض رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی تصویب سے جاری فرمائے ہیں۔ دین کے ان بنیادی احکام میں اللہ کی بندگی بجالانے کا ایک طریقہ نماز کی صورت میں مقرر کیا گیا ہے۔ پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں اور انھیں انفاق سے تعبیر کر کے من جملہ عبادات قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح سال میں ایک ماہ کے روزوں کو عبادت کی حیثیت سے جاری رکھا گیا ہے۔

روزے کا مقصد — تقویٰ

روزہ کس لیے فرض کیا گیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اس بات کو خود قرآن مجید نے ’لعلکم تتقون‘ کے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی بندوں پر روزہ اس لیے لازم کیا گیا ہے کہ ان کے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تقویٰ کے مفہوم و مدعا کو ہم حسب ذیل عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

تقویٰ کا مفہوم

تقویٰ ہمارے دین کی خاص اصطلاح ہے۔ اسی کا مدعا بالکل وہی ہے جسے ہم اردو زبان میں حدود آشنائی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی انسان اس دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے نچت اور بے خوف نہ رہے، بے پروائی اور لاپرواہی کا رویہ اختیار نہ کرے، بلکہ متنبہ ہو کر، بیدار ہو کر اور خبردار ہو کر زندگی گزارے۔ وہ اس بارے میں کبھی غفلت میں مبتلا نہ ہو کہ وہ اس دنیا میں کس لیے بھیجا گیا ہے، اس کا منتہا کیا ہے، اس کو ایک دن کس صورت حال سے دوچار ہونا ہے، اس کے لیے حقیقی زندگی کون سی ہے؟ وہ ان حقائق کے بارے میں پوری طرح متنبہ رہے اور زندگی کے کسی مرحلے میں بھی ان سے غافل نہ ہو۔ جب انسان اس متنبہ اور اس بیداری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو پھر وہ اپنی خواہشات کی غلامی میں مبتلا نہیں ہوتا۔

اللہ کی بندگی تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان دنیا میں اللہ کا فرمان بردار بندہ بن کر زندگی گزارے۔ انسان کے لیے اصل آزمائش ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی نعمتیں پا کر اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہتا ہے یا کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ انسان جب نافرمانی، سرکشی اور انتہا پسندی سے گریز کر کے اللہ تعالیٰ کے حدود کی پاس داری کرتا ہے تو گویا وہ تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اس بندگی کے معنی یہ ہیں کہ:

”بندہ اس تعلق میں اپنے پروردگار کی یاد سے اطمینان حاصل کرتا، اس کی عنایتوں پر اس کے لیے شکر کے جذبات کو اپنے

اند رسیل بے پناہ کی طرح اٹھتے ہوئے دیکھتا، اس کی ناراضی سے ڈرتا، اسی کا ہو رہتا، اس کے بھروسے پر جیتا، اپنا ہر معاملہ

اس کے سپرد اور اپنے پورے وجود کو اس کے حوالے کر دیتا اور زندگی میں ہر قدم پر اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔“ (جاوید احمد غامدی، میزان ۷۸)

اللہ کے ہاں جواب دہی کا احساس تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان ہر لحظہ اس بارے میں متنبہ رہے کہ اسے ایک روز احکم الحاکمین کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ ایک وہ وقت آنا ہے جب اسے اس کی ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ ٹھہرایا جانا ہے۔ جواب دہی کا یہی احساس ہے جو انسان کو زندگی کی راہ پر خار پر بیچ بچا کر اور دامن کو سمیٹ کر چلنے کا طرزِ عمل سکھاتا ہے۔ یہی احساس اور یہی طرزِ عمل اصل میں تقویٰ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ایک صحابی نے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ اگر کبھی آپ کسی کانٹوں بھرے راستے سے گزریں تو اس میں کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں؟ صحابی نے کہا کہ میں اپنے دامن کو سمیٹ لیتا ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بس یہی تقویٰ ہے۔

تزکیہٴ نفس کے لیے جدوجہد تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کے تزکیے کے لیے سرگرم عمل رہے۔ دین کا مقصد تزکیہٴ نفس ہے۔ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں اپنے آپ کو پاکیزہ رکھنے کی کوشش ہی اصل میں تقویٰ ہے۔

اپنے نفس پر قابو پانا تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کے ان میلانات پر قابو رکھے جو اسے بدی پر ابھارتے ہیں۔ وہ غصے پر قابو رکھے، جذبات کے سیلِ رواں کو حدود میں رکھے، ردِ عمل کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو، نفرت اور کدورت کو اپنے اندر پیدا نہ ہونے دے، مادی لذات اور نفسانی خواہشات کو حدود میں رکھے، بطن و فرج کے تقاضوں کو اپنے دینی و اخلاقی وجود پر غلبہ نہ پانے دے۔ وہ یہ فیصلہ کر لے کہ اسے اپنے نفس کے آگے نہیں جھکنا، بلکہ اسے اپنے آگے جھکانا ہے۔ گویا تقویٰ سے مقصود نفس کو جھکانا ہے، اسے مارنا نہیں ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں اس حقیقت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان لگا ہوتا ہے۔ پوچھا گیا کہ کیا آپ کے ساتھ بھی شیطان ہے؟ فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ہے، مگر میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کو اپنے نفس کا گلا نہیں گھونٹ دینا چاہیے، بلکہ اسے حدود کا پابند بنانا چاہیے۔

ذمہ داری سے زندگی بسر کرنا تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو دل جمعی اور خلوصِ نیت کے ساتھ نبھائے۔ وہ ان حقوق کو ادا کرے جو اس کی

انفرادی حیثیت میں اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ان فرائض کو بجالائے جو خاندان کے اندر اس پر لاگو ہوتے ہیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ براہوجن کا تقاضا معاشرہ اور ریاست کرتے ہیں۔ یعنی آدمی اسی دنیا میں رہے، اسی میں اپنا رزق کمائے، اسی میں اپنا فعال کردار ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اسے اپنی اس فطرت سے انحراف کرنے کے بجائے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہی کوشش اور جدوجہد تقویٰ ہے۔

اخلاقی وجود کی حفاظت تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان ہر وقت اپنے اخلاقی وجود کی نگہبانی کرتا رہے۔ یہ اخلاقی وجود ہی ہے جو انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر کا پورا شعور دے کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر وہ خیر و شر کے واضح ادراک کے ساتھ اچھا یا برا فیصلہ کرتا ہے۔ ہر اچھا فیصلہ کرتے وقت وہ ان اخلاقی اقدار اور ضوابط کو ملحوظ رکھتا ہے جو انسانیت کا شرف ہیں اور اس کے پروردگار نے اس کی فطرت میں ودیعت کیے ہیں۔ انھیں ہر انسان اپنے اندر ضمیر کی آواز کے طور پر محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ ان کا لحاظ کرتا ہے تو انسان ہے، اگر لحاظ نہیں کرتا تو پھر محض دو ٹانگوں کا ایک جانور ہے، اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اخلاقی وجود کی حفاظت و نگہبانی سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر کام کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ یہ کام اس کے شایانِ شان ہے بھی یا نہیں۔ اس کا اخلاقی وجود اس سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولے، دھوکا نہ دے، خیانت نہ کرے، ظلم نہ کرے، حق نہ مارے، بے انصافی نہ کرے۔ اخلاقی وجود اس سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ ذمہ داریوں کو پورا کرے، حقوق ادا کرے، صداقت کا بول بالا کرے، مخلوق خداوندی سے محبت کرے، نعمت پر شکر کرے، مصیبت میں صبر کرے، بڑے کا ادب کرے، چھوٹے پر شفقت کرے۔ غرض یہ کہ اپنے ضمیر کی آواز پر کان لگائے رکھے۔ وہ اگر کسی کام سے روک دے تو رک جائے اور اگر کسی کام کی ترغیب دے تو اسے بخوبی انجام دے۔

تقویٰ رہبانیت نہیں ہے

انسان کی آزمائش یہ ہے کہ اسے اپنی خواہشات، اپنے جذبات اور اپنی رغبات کے اندر ہی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔ انسانی جبلت میں موجود یہ ساری چیزیں پورا زور لگاتی ہیں کہ وہ اعتدال اور توازن کے راستے پر نہ رہے۔ جب انسان ان کے خلاف جنگ کرتا ہے تو بعض اوقات دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ دوسری انتہا مذہب میں رہبانیت کے نام سے موسوم رہی ہے۔ اس کی ایک بڑی درد انگیز تاریخ ہے۔ گویا انسان جب مادی زندگی کی لذتوں کو اپنا اصل ہدف بناتا ہے تو اس سے بہت غیر معمولی مفسد پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے جب وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں ترک دنیا کو اپنا ہدف ٹھہراتا ہے

تو اس سے بھی بے پناہ مفسدات پیدا ہوتے ہیں۔ رہبانیت اور ترک دنیا کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایک بار یہ فیصلہ کر لے کہ اسے دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو جانا ہے۔ اس دنیا کے اندر جو چیزیں اس کے لیے آزمائش کے طور پر پیدا کی گئی ہیں، انھیں چھوڑ دینا ہے۔ علم و عقل، مال و دولت، حسن و جمال، حشمت و اقتدار غرض مادی زندگی کے جو داعیات بھی انسان کو حدود سے تجاوز پر آمادہ کر سکتے ہیں، وہ انھیں بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں وہ نفس کے داعیات کا کم سے کم جواب دہ ہو۔ جب انسان رہبانیت کی یہ صورت اختیار کرتا ہے تو بظاہر وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے دنیا کی آزمائش میں اپنے لیے ایک آسان راستہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ پہلی بار بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن ایک بار جب کر لیا جاتا ہے تو پھر اس کے بعد اس میں وہ مشکلات نہیں رہتیں جن سے ایک متقی آدمی ہر روز گزر رہا ہوتا ہے۔ رہبانیت اور ترک دنیا کا یہ راستہ فطرت اور دین سے انحراف کا راستہ ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی شریعت انسان کو اعتدال اور توازن کا راستہ بتاتی ہے۔ وہ انسان کو جس چیز کی تربیت دیتی ہے، وہ رہبانیت نہیں ہے، بلکہ تقویٰ ہے۔

تقویٰ کے حصول کا طریقہ

تقویٰ کی منزل کو پانے کا کیا طریقہ ہے؟ اس ضمن میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

ایک یہ کہ تقویٰ کے حصول کے لیے تدریج کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دین کی حکمت بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اگر کوئی صلاحیت یا کوئی رویہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہے تو وہ اسے فوراً پیدا نہیں کر سکتا، بلکہ ارادہ اور عمل کے مسلسل تعامل سے اسے تدریجاً اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص نیکوں کی ایک فہرست بنا کر اپنے سامنے رکھے اور انھیں فوراً اپنی شخصیت کا حصہ بنا لے۔ یہ ممکن نہیں کہ پانچویں جماعت کے بچے کو ایم۔ اے کا کورس پڑھانا شروع کر دیا جائے۔ علوم کے حصول لیے بہر حال تدریجی مراحل مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ فنون سیکھنے کے لیے بھی مشق اور مزاوالت کے تدریجی مراحل طے کیے جاتے ہیں۔ دینی و اخلاقی تربیت کا اصول بھی یہی ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی صورت میں ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا کہ بعثت کے ساتھ ہی پوری کتاب آپ کے سپرد کر دی ہو، بلکہ دعوت کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے تدریج کے ساتھ قرآن نازل فرمایا۔ چنانچہ تقویٰ کی منزل پانے کے لیے بھی تدریجی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اپنے روزمرہ معمولات میں یہ تین چیزیں لازماً شامل کر لی جائیں:

۱۔ روزانہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھی جائے۔

۲۔ روزانہ چند آیات قرآنی کی سمجھ کر تلاوت کی جائے۔

۳۔ ہفتے میں کم سے کم ایک بار کسی صالح بندہ خدا کی مجلس میں کچھ وقت گزار جائے۔
مسجد کا ماحول، قرآن مجید کی براہ راست تذکیر اور بندہ مومن کی صحبت کی تاثیر نخل تقویٰ کی آب یاری میں بنیادی کردار ادا کرے گی۔

روزہ تقویٰ کی تربیت گاہ ہے

تقویٰ کی تربیت دینے کے لیے شریعت نے روزے کی عبادت کو خاص کیا ہے۔ سال میں ایک مرتبہ ۲۰ گھنٹے کی تربیت گاہ قائم کر دی جاتی ہے اور نہایت غیر معمولی طریقے سے کروڑوں لوگ اس سے گزرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”روزے کی عبادت اس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقا کا انحصار ہے اور جس کے حاملین ہی کے لیے قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ گویا قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اس تقویٰ کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے اس وجہ سے رب کریم و حکیم نے اس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینا موسم بہار ہے اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشوونما بخشتا ہے وہ تقویٰ کی فصل ہے۔“ (تذکرہ قرآن ۱/۴۵۱)

روزہ اللہ ہی کے لیے ہے

ایک بندہ مومن روزہ رکھ کر درحقیقت اپنے پروردگار کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرتا ہے اور فقط اس کی رضا جوئی کے لیے اپنی جسمانی ضرورتوں اور جائز خواہشوں سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کو خاص اپنے لیے قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”ابن آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا، دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صرف روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا، کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔“ (مسلم، کتاب الصوم)

روزے کی شریعت

اہل عرب کے ہاں دیگر عبادات کی طرح روزہ بھی ایک معلوم و معروف عبادت تھی۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ قرآن مجید نے آ کر اس عبادت کو شروع کیا۔ ”کما کتب علی الذین من قبلکم“ جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، کے الفاظ بھی اسی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں۔ چنانچہ روزے کی شریعت کے حوالے سے قرآن مجید نے صرف انہی معاملات کو

واضح کیا جن کے بارے میں لوگوں کے ہاں کچھ ابہام موجود تھا یا جن میں کچھ تجدید و اصلاح کی ضرورت تھی۔ یہ معاملات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ماہِ رمضان کا تعین

روزوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیا ہے۔ اس مہینے کو اس لیے خاص کیا گیا کہ اس میں قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا۔ ارشاد فرمایا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ
هُدًى لِلنَّاسِ - (البقرہ ۲: ۱۸۵)

”رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن اتارا گیا
لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔“

مولانا امین احسن اصلاحی اس پہلو کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”رمضان وہ مبارک مہینا ہے جس میں دنیا کی ہدایت کے لیے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس عظیم نعمت کی شکرگزاری کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرمادیا تاکہ اس میں بندے اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات سے آزاد ہو کر اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں اور اپنے قول و فعل، اپنے ظاہر و باطن اور اپنے روز و شب، ہر چیز سے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کریں کہ خدا اور اس کے حکم سے بڑی ان کے نزدیک اس دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔“ (تذکرہ قرآن ۱/۱: ۳۵۱)

۲۔ گنتی کے چند دن

قرآن مجید نے روزوں کی مدت کو ایسا ماً معدودات، ”گنتی کے چند دن“ سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے مراد ماہِ رمضان کے ۳۰ یا ۲۹ دن ہیں۔ یعنی روزے کی یہ مشقت زیادہ عرصے کے لیے نہیں ڈالی گئی، بلکہ سال بھر میں یہ گنے چنے چند روز ہیں جن میں روزہ فرض کیا گیا ہے۔ گویا یہ تزکیہ نفس اور تقویٰ کی تربیت کا محض چند روزہ کورس ہے، اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

۳۔ روزے کے اوقات

روزے کے اوقات کے حوالے سے قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ
الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ
ثُمَّ أَتَمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الْإِيلِ - (البقرہ ۲: ۱۸۷)

”اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب
کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے، پھر رات تک
روزہ پورا کرو۔“

مولانا امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے، یہ چیز ہمارے روزوں کو اہل

کتاب کے روزوں سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں رات کو اٹھ کر کھانے پینے یا ازدواجی تعلقات کی اجازت نہیں تھی۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت دی، بلکہ اس کی تاکید کی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے بھی یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ اجازت صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہو جانے تک ہے، اسی بات کی تائید احادیث اور صحابہ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے محض احتیاط کے غلو کے سبب سے اپنے یا دوسروں کے روزے محض معمولی تقدیم و تاخیر پر مشتبہ قرار دے بیٹھنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔“ (تذکرہ قرآن ۱/۴۵۹)

”روزے کو رات ہونے تک پورا کرو“ کے حکم کے اطلاق کے حوالے سے اس امت کے فقہاء میں کچھ اختلاف رہا ہے۔ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ رات کا آغاز ہوتا ہے ہی روزہ کھول لینا چاہیے۔ بعض اہل علم کے نزدیک جب کچھ رات گزر جائے تو پھر روزہ افطار کرنا چاہیے۔ اس اختلاف کے نتیجے میں عملاً تقریباً دس پندرہ منٹ کا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات کو سمجھنے کا اختلاف ہے۔ اسے بڑا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ جس بات پر اطمینان محسوس ہو اسے اختیار کر لینا چاہیے۔

۴۔ مریضوں اور مسافروں کے لیے رخصت

ابتدائی طور پر قرآن مجید نے یہ رخصت دی تھی کہ اگر کوئی شخص حالت مرض میں یا حالت سفر میں ہونے کی وجہ سے روزے چھوڑنا چاہے تو وہ بعد میں چھوڑے ہوئے روزوں کو پورا کر لے یا پھر ایک روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔
”اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر دے۔ اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔“ (البقرہ ۲: ۱۸۴)

بعد ازاں قرآن مجید نے مسکین کو کھانا کھلا کر روزے سے بری ہونے کی اجازت ختم کر دی:
وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔ (البقرہ ۲: ۱۸۵)
”اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔“

۵۔ رمضان کی راتوں میں ازدواجی تعلق کی اجازت

اہل عرب میں سے یہود کے ہاں روزے کی عبادت سب سے نمایاں تھی۔ ان کے ہاں افطار کے ساتھ ہی اگلا روزہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس وجہ سے انھیں رات کے اوقات میں کھانے پینے اور زن و شو کے تعلق کی ممانعت تھی۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے باعث تردد تھی۔ چنانچہ بعض مسلمانوں نے اسی تردد میں اپنے تئیں یہ تصور کر لیا کہ رات کے اوقات میں ازدواجی تعلق

ممنوع ہے۔ پھر بعض لوگوں نے اپنے اس تصور کی خلاف ورزی بھی کر ڈالی۔ اسی کو قرآن مجید نے اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر فرمایا ہے، مسلمانوں کی یہ ہدایت چونکہ شریعت کے منشا کے مطابق نہیں تھی اور بعض محتاط مسلمانوں نے اسے از خود اپنے اوپر عائد کر لیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس خیانت سے درگزر فرمایا اور رات میں بیویوں سے تعلق کی اجازت دے دی:

”تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور اللہ نے جو تمہارے لیے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔“

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئِنْ بَاشَرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ - (البقرہ ۲: ۱۸۷)

اعتکاف

اعتکاف رمضان کے آخری عشرے کی عبادت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ خدا ہر چیز سے کٹ کر اور دنیا کے ہر معاملے سے الگ ہو کر پوری یک سوئی کے ساتھ یاد الہی کے لیے گوشہ نشین ہو جائے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

”اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو اس حالت میں بیویوں سے نہ ملو۔“

وَلَا تَبَاشَرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ حَاكِفُونَ فِي الْمَسْجِدِ - (البقرہ ۲: ۱۸۷)

اس آیت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اعتکاف کا ذکر جس طریقے سے کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت پہلے سے موجود تھی۔

دوسرے یہ کہ اس عبادت کی مناسبت روزے اور رمضان کے ساتھ ہے۔

تیسرے یہ کہ اعتکاف مسجد ہی میں ہونا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ اعتکاف کی حالت میں ازدواجی تعلق پر پابندی ہوگی۔

ماہ رمضان تقویٰ کی تربیت پانے کا مہینا ہے۔ اس مہینے کو انسان اگر پوری قوت ارادی کے ساتھ اپنے نفس کی اصلاح و

تربیت کے لیے خاص کر دے تو وہ خواہشات اور جذبات کی غلامی سے نکل کر اپنے پروردگار کی غلامی میں آجاتا ہے۔ یہی

غلامی جنت کی ابدی بادشاہی کا پیش خیمہ ہے۔